(۴۲)

(فرمودہ ۱۲ اگست ۱۹۵۳ء بمقام ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی)

بوجہ اس کے کہ رستہ میں غالباً ایک جگہ کھانے میں خرابی تھی اور گھی خالص نہیں تھا، میرا گلا بیٹھ گیا۔ یہاں آکر بھی ابھی گلے کی خرابی برابر چلی جارہی ہے اور وہ درست ہونے میں نہیں آتی، شاید یہاں بھی گھی میں خرابی اور ملاوٹ ہے۔ بہرحال گلے کی سوزش اور آواز کے بیٹھنے اور پھر پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے میں زیادہ دیر تک کھڑا نہیں ہوسکتا۔ یوں تو پاؤں میں ایسی تکلیف نہیں جو کھڑے ہونے میں زیادہ دقت پیدا کرسکے، صرف انگوٹھے میں تکلیف ہے اور پاؤں کے دوسرے حصّہ پر دباؤ ڈال کر مَیں کھڑا ہوسکتا ہوں لیکن اگر کوئی اور تکلیف ہوجائے تو پھر اسے بھی مَیں محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اسی سفر میں مَیں نے انگوٹھے کی تکلیف کے باوجود ایک لمبا خطبہ دیا تھا جواب تک مَیں درست نہیں کرسکا کیونکہ اس کا بھی طبیعت پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال عید الاضحیہ کا خطبہ ایک مسنون خطبہ ہے اور ایک بڑے واقعہ کی یاد دلاتا ہے اس لئے کچھ نہ کچھ تو اس موقعہ کے مناسبِ حال کہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف کے باوجود میں یہاں آگیا ہوں۔

قوموں میں یادگاریں قائم رکھنے کا بڑا بھاری رواج ہے اور مختلف قومیں اپنی اپنی یادگاریں قائم رکھتی ہیں۔ اوروں کو جانے دو چوہڑوں اور چماروں تک میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی قومی روایات کو قائم اور زندہ رکھیں اور انہوں نے بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی فخر کی بات نکالی ہوئی ہوتی ہے۔

علم النفس کے ماہرین کا تجربہ ہے کہ انسانی جدوجہد جو اپنے نفس کی بہتری کے لئے کیجاتی ہے، اس کو جاری رکھنے اور پوری شان کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے جن ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے ان ذرائع میں سے زیادہ اہم اور مؤثر ذریعہ ٹریڈیشنز (TRADITIONS) یعنی روایاتِ سابقہ ہوتی ہیں۔ ایک بچہ جب اپنے کام کے لئے اپنی جدوجہد کو لمبا نہیں کرسکتا تو اس کے رشتہ دار اور دوست اور عزیز و اقرباء اسے کہتے ہیں کہ ذرا یاد رکھنا تم کن کی اولاد میں سے ہو اور فوراً اس کی طبیعت اصلاح کی طرف مائل ہوجاتی ہے اور وہ اپنی ناکام جدوجہد کو کامیابی میں بدل دیتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس طریق کو استعمال کیا ہے اور اس نے لوگوں کے سامنے ان کے آباء کے کارنامے رکھے ہیں بلکہ قرآن کریم نے یہ حربہ دوہرے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس نے کفّار کے آگے بھی ان کے آباء کے کارنامے رکھے ہیں اور انہیں توجہ دلائی ہے کہ جب تم ایسے

ذلیل لوگوں کی نسل میں سے ہو تو تم کیسے کامیاب ہو سکتے ہو اور اس نے مسلمانوں کے سامنے بھی ان کے پیشرووں کے کارنامے رکھ کر بتایا ہے کہ تم ایسے شاندار پیشرو لوگوں کے قائم مقام ہو تو کس طرح ناکام ہو سکتے ہو جب مسلمان دکھوں اور تکالیف سے گھبراتے تھے تو ان کے سامنے یہ بات پیش کی جاتی تھی کہ تمہارے پیشرووں نے تم سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جب کبھی دشواریوں نے ان کی ہمتوں کو پست کرنا چاہا تو فوراً ان کے سامنے یہ بات رکھدی گئی کہ تمہارے پیشرووں کے سپرد جو کام تھے وہ بھی اپنی عظمت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں تھے بلکہ بہت بڑے تھے اسی طرح اگر مسلمانوں نے کبھی قربانی کرنے میں سستی دکھائی تو انہیں بتایا گیا کہ پہلے لوگوں نے بھی بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو ہمت دلانے کے لئے یہی طریق اختیار کیا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ان مصائب اور آلام کی وجہ سے جو دشمن کی طرف سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ گھبراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں تو آپ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن سے یہ سلوک کیا گیا کہ انہیں کھڑا کرکے ان کے سروں پر آرہ رکھ دیا جاتا اور پھر انہیں چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا مگر پھر بھی وہ اُف تک نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے ان سخت مشکلات کو برداشت کر لیا تو تم کیوں برداشت نہیں کر سکتے۔ غرض ٹریڈیشن یا کسی قوم کے بزرگوں کی سابقہ روایات اس قوم کو ہمت دلانے اور اسے سیدھے راستہ پر قائم رکھنے میں بڑی ممد ہوتی ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو ہماری ٹریڈیشن تو سورۃ فاتحہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دعا سکھلاتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ اے خدا تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا وہ رستہ جو منعم علیہ لوگوں کا تھا اور جس پر چل کر وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ یہ منعم علیہ گروہ ہی ہے جسے قرآن کریم نے مسلمانوں کا آباء واجداد قرار دیا ہے دنیوی آباء دنیوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور روحانی آباء روحانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خالصۃً نسلاً بعد نسلٍ بغیر کسی شبہ کے ابراہیم علیہ السلام کا پوتا ہو لیکن ابراہیم علیہ السلام کی خوبیوں اور اس کے کمالات سے اسے کچھ نہ ملا ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نسلی لحاظ سے ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں سال کا فاصلہ رکھتا ہو اور اس کا کوئی باپ دادا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہ ہو لیکن سو یا دو سو یا ہزار پشتوں کے باوجود پھر بھی وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو کیونکہ ابراہیمؑ یہودیوں کا باپ نہیں تھا۔ ابراہیمؑ خلیفۃ اللہ تھا اور خلیفۃ اللہ ہونے کے لحاظ سے وہی اس کی نسل تھی جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار مسلمانوں کو ابراہیمی طریق پر چلنے کی ہدایت دیتا ہے اور ابراہیمؑ کے طریق عبادت کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم خود کہتا ہے کہ

انبیاء سابقین میں سے کوئی نبی بھی ایسا نہیں جو ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہو۔ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ایک ایسے وجود ہیں جو ساری دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ مجھے خدا تعالےٰ نے ابیض و اسود اور احمر و اصفر سب کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے اور مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں کوئی شخص ایسا نہیں جو میرے دائرہ ہدایت سے باہر ہو۔ مگر اس کے باوجود جب اللہ تعالےٰ سب مسلمانوں کو ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان کی جسمانی نسل سے نہیں بلکہ ساری دنیا سے خطاب کرتا ہے۔ اور روحانی لحاظ سے ساری دنیا کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے قرار دیتا ہے ورنہ ابراہیم علیہ السلام صرف ایک قوم کی طرف آئے تھے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے بلکہ ایک قوم بھی نہیں صرف ایک قبیلہ تھا جس کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ بلکہ اگر ہم بائیبل کے بیان کو دیکھیں تو ایک قبیلہ بھی نہیں صرف ایک خاندان تھا جس کی ہدایت کے لئے وہ مبعوث ہوئے۔ پس یہ کہنا کہ وہ شخص صرف ایک خاندان کی طرف آیا تھا تم اس کے نقشِ قدم پر چلو بتاتا ہے کہ تم کو اس کا خاندان قرار دیا جاتا ہے اور تم بھی آئندہ ابراہیمی نسل میں سے ہو۔

غرض قرآن کریم نے ہمارے لئے ہمارے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھا ہے اگر ہم ان روایات کو یاد رکھیں تو ہمارے اخلاق اور ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو بڑھانے میں یہ بات بہت کچھ مدد دے سکتی ہے یہ بات جو میں نے تمہارے سامنے بیان کی ہے یہ علم النفس کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے اتنی اہم کہ انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کو بالکل بدل دیتی ہے۔ میں نے تمہیں یہ نکتہ بتایا ہے کہ عید آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی۔ لوگ سمجھتے ہیں اسمٰعیلؑ نے اپنی جان خدا تعالےٰ کے لئے دیدی جس وقت لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی اور جس وقت لوگ کہتے ہیں کہ اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی تو دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ سامی نسل کے ایک انسان ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا سامی نسل کے ایک انسان اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نکال رہے ہوتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔ اگر وہ ایسی قربانی کر سکتے تھے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ مگر جو بات میں نے بیان کی ہے اس کے نتیجہ میں جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ایک سامی نسل کے انسان ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا ایک سامی نسل کے انسان اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے دادا ابراہیمؑ نے یہ قربانی کی یا میرے دادا اسمٰعیلؑ نے یہ قربانی کی۔ اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے باپ دادا کہنے اور سامی نسل کے

ایک باپ اور دادا کہنے میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ ایک شخص سمجھتا ہے کہ سامی نسل کا ایک انسان تھا جس نے یہ قربانی کی۔ وہ بھی انسان تھا اور میں بھی انسان ہوں۔ اگر وہ یہ کام کر سکتا ہے تو میں بھی یہ کام کر سکتا ہوں لیکن دوسرا شخص سمجھتا ہے کہ مجھے قرآنی اصطلاحات نے ابراہیمؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے۔ مجھے قرآنی اصطلاحات نے اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے۔ پس ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے جو کچھ کیا سامی نسل کے لئے نہیں کیا بلکہ میرے ایک باپ اور میرے ایک دادا نے یہ کام کیا اور میں بھی اس کا خون اپنے اندر رکھتا ہوں۔ جو شخص اس نقطہ نگاہ سے ابراہیمؑ کی قربانی کو دیکھتا ہے اس کے جذبات بالکل اور ہوتے ہیں۔ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات حدیثوں میں پڑھتے ہیں یہ حدیثیں شیعوں کی بھی ہیں اور سُنیوں کی بھی ہیں لیکن جب شیعوں کی حدیثیں پڑھی جائیں تو ان میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ہمارے نانا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں کہا یا ہمارے دادا علیؓ نے یوں کہا۔ اب جس شان کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نانا اور علیؓ کو دادا کہنے والے راوی کا قول نظر آتا ہے اسی شان کے ساتھ کسی دوسرے راوی کا قول کہاں نظر آ سکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں درود میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں یہی بتایا گیا ہے۔ کہ ہر مسلمان کو اپنی ذہنیت ایسی بدل لینی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے سمجھنے لگے۔ جب ہم دُعا کرتے ہیں کہ الٰہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کی آل پر فضل نازل کر۔ تو ظاہر ہے کہ اس جگہ آل سے مراد صرف نسل نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ شخص ہوتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقۂ غلامی میں شامل ہوتا ہے۔ آخر انسان کا کوئی فقرہ اس کے عام طریق کار اور معمول سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ یا تو ہمیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی ایسی دُعا نظر آنی چاہیئے جس میں آپ نے عام مسلمانوں کو باہر رکھا ہو اور صرف اپنی نسل کو شامل کیا ہو اور یا پھر یہی سمجھنا چاہیئے کہ اس جگہ آل سے صرف جسمانی آل مراد نہیں بلکہ روحانی آل مراد ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے کوئی الگ دعا نہیں کی تو ماننا پڑے گا کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں سارے مسلمانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اور آل سے صرف جسمانی آل مراد نہیں بلکہ رُوحانی آل مراد ہے۔ اور روحانی آل جسمانی آل سے کم نہیں ہوتی۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں عملاً اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ جب صلح حدیبیہ کا موقعہ آیا تو عرب لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ اگر ہم مسلمانوں کو عمرہ سے روکیں گے تو سارے عرب میں ہماری بدنامی ہو گی اور دوسری طرف اگر ہم نے ان کو نہ

آنے دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زور سے داخل ہوئے ہیں انہوں نے ایک درمیانی طریق نکالا کہ ہم آپس میں صلح کرلیں اور اگلے سال مسلمانوں کو طواف کعبہ کے لئے آنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ انہوں نے عرب کا ایک بڑا سردار صلح کے لئے بھجوایا۔ وہ اتنا بڑا سردار تھا کہ سارا عرب اس کی عزت کرتا تھا اور وہ اتنا مخیر تھا کہ مکہ کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس کے احسان کے نیچے نہ ہو۔ مکہ والے جانتے تھے کہ جب یہ سردار گیا تو مسلمان جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ان کی آنکھیں اس کے سامنے نیچی ہو جائیں گی چنانچہ وہ آیا اور اس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو شروع کی۔ بات کرتے وقت جیسے گاؤں کے لوگوں اور زمینداروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کی داڑھی کو اپنا ہاتھ لگاتے ہیں اس نے بھی متکبرانہ لہجہ میں کہا کہ جانتے ہو میری کیا حیثیت ہے۔ میں سارے عرب کا سردار ہوں تم کچھ تو میرا لحاظ کرو۔ اور دیکھو میں تمہاری داڑھی کو ہاتھ لگاتا ہوں کہ میری عزت کا خیال کرو۔ یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کی طرف بڑھایا۔ اس پر ایک صحابی نے زور سے اپنی تلوار کا کندہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک داڑھی کو مت لگا۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا کہ یہ شخص کون ہے اور اسے پہچان کر کہنے لگا کہ تم فلاں ہو۔ کیا تم میں بھی جرأت ہے کہ تم میرے ہاتھ کو اپنی تلوار کے کندہ سے ہٹاؤ۔ کیا تمہیں میرے فلاں فلاں احسانات یاد نہیں رہے؟ چونکہ اس صحابی کا خاندان اس سردار کا ممنونِ احسان تھا اس لئے جب اس نے یہ فقرہ سُنا تو پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوا اور اس نے کہا میں بزرگ ہوں۔ بڑی عمر گذار چکا ہوں۔ تم زمانہ کے حالات کو سمجھو۔ یہ لوگ جن میں سے کوئی کسی جگہ کا آدمی ہے اور کوئی کسی جگہ کا آدمی۔ یہ تمہارے کیا کام آسکتے ہیں۔ آخر اپنے خاندان کے آدمی اور اپنے بھائی ہی کام آیا کرتے ہیں۔ تم ان کے لئے اپنے بھائیوں سے نہ لڑو۔ اور دیکھو میں تمہیں یہ بات کہتا ہوں اور پھر اس نے آپ کی داڑھی کو ہاتھ لگانا چاہا اس پر ایک اور شخص آگے بڑھا اور اس نے اپنی تلوار کا کندہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا۔ اپنے ناپاک ہاتھ پیچھے ہٹا۔ اس نے پھر اوپر کی طرف آنکھ اٹھائی اور پہچان کر کہنے لگا کیا تم میں جرأت ہے کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں اور میرے تم پر کتنے احسانات ہیں؟ اس پر وہ بھی شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ غرض وہ بار بار زور دیتا کہ اپنے خاندان کے لوگوں سے نہیں لڑنا چاہیئے۔ ان کے تعلقات دوسروں کے قائم مقام نہیں ہو سکتے یہ لوگ منہ سے تو باتیں کرتے ہیں مگر اتنی محبت نہیں رکھ سکتے جتنی محبت رشتہ دار رکھا کرتے ہیں

اس وقت ایک ایک صحابی کے دل میں جوش آتا تھا کہ ہم اسے پیچھے ہٹائیں مگر وہ سب کے سب مجبور تھے کیونکہ ان کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ اس شخص کے ہم پر احسانات ہیں۔ تب صحابہؓ کہتے ہیں اس وقت ہمارے دل میں دعا کا جوش پیدا ہوا اور ہم نے کہا۔ خدا اب کسی ایسے بندے کو آگے لائے جس پر اس کا احسان نہ ہو۔ تب ایک شخص آگے بڑھا اور جب پھر اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس نے ایک سخت لفظ استعمال کر کے جو میں خطبہ میں دُہرا نہیں سکتا مگر بخاری میں موجود ہے۔ زور سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیکر پیچھے ہٹا دیا اور کہا کہ اپنا ناپاک ہاتھ پیچھے ہٹا۔ اس نے آنکھیں اُٹھائیں یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ کون شخص ہے اور پھر اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا کہ میں تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا تجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ نیا شخص ابوبکرؓ تھا۔ گویا سارے صحابہؓ میں سے صرف ایک ابوبکرؓ ہی تھے جن پر اس کا کوئی احسان نہیں تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سارے اس کے احسانوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے وہ کچھ نہیں کر سکتے تو انہوں نے سمجھا کہ اب میرا کام ہے کہ میں آگے آؤں تو رشتہ داروں کی محبت اور ان کے فوائد بتانے کا واقعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔

مگر پھر وہی لوگ جن کے متعلق پنجابی محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے کہ یہ وَنْ وَنْ کی لکڑی ہے۔ مختلف جنگلوں کی لکڑی ہے، انہوں نے اپنے اخلاص اور فدائیت کا وہ نمونہ دکھایا جس کی نظیر دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ وَنْ وَنْ کی لکڑی تھی اور وَنْ وَنْ کی لکڑی کارآمد نہیں ہوتی۔ اگر تم نے اچھا فرنیچر تیار کرنا ہو اور مختلف قسم کی لکڑیاں تمہارے پاس ہوں۔ کوئی دو سال کی ہو۔ کوئی پانچ سال کی ہو کوئی دس سال کی ہو، کوئی سو سال کی ہو اور پھر کوئی شیشم کی ہو، کوئی کیکر کی ہو، کوئی گیلی ہو اور کوئی سوکھی تو کبھی تم اس سے اچھا فرنیچر تیار نہیں کر سکتے۔ اچھے فرنیچر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک جگہ اور ایک عمر اور ایک ہی قسم کی لکڑی ہو۔ اگر مختلف جنگلوں سے مختلف قسم کی لکڑی کاٹ کر لائی جائے تو عمدہ فرنیچر نہیں بن سکتا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت سے اور آپ کی دعاؤں اور روحانیت کی برکت سے وہی جو مختلف جنگلوں کی کاٹی ہوئی لکڑیاں تھیں ان میں اتنا اتحاد پیدا ہو گیا کہ کوئی رشتہ دار اپنی محبت کا اس قسم کا نمونہ نہیں دکھا سکتا جس قسم کا نمونہ انہوں نے دکھایا۔

اسلام کی سخت ترین جنگوں میں سے ایک غزوۂ احزابؓ ہے۔ عام طور پر مسلمان چونکہ تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے اس لئے وہ بدر اور اُحد کی تفصیلات سے تو واقف ہیں لیکن احزاب سے نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس پر خاص زور دیا ہے۔ کیونکہ احزاب کی جنگ ہی ہے جس میں دشمن نے متحدہ طور پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اور ایسی صورت میں کیا کہ ظاہری حالات

کے لحاظ سے مسلمانوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھہرنا بالکل ناممکن نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں صرف بارہ سو تھی جس میں سے پانچ سو مسلمان عورتوں کی حفاظت کے لئے رکھے گئے تھے اور صرف سات سو مسلمان دشمن کے مقابلے میں کھڑے کئے گئے تھے۔ اور دشمن کی کم سے کم تعداد دس ہزار تھی جسے چوبیس ہزار تک بھی بیان کیا جاتا ہے۔ پھر یہ سارے عرب کا مقابلہ تھا۔ مکہ کے تمام قبائل اس میں شریک تھے اور یہودی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ عرب کے ایک ایک قبیلہ کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ اور پھر ان کے آپس میں خونی رشتے بھی تھے۔ اور وہ سب مل کر اپنی جان دینے کے لئے تیار اور آمادہ تھے۔ ادھر مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے اپنے پہلو میں یہودی لوگ تھے جن سے ان کا معاہدہ تھا مگر یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ کسی وقت کوئی شرارت نہ کر دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لینے کے بعد شہر کی اس جہت میں جو بے حفاظت تھی اور جس طرف سے دشمن کے حملہ کا امکان تھا قریباً ایک میل لمبی خندق کھدوا دی تھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس چونکہ سامان کم تھا اور آدمی بھی تھوڑے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ زیادہ لمبی، زیادہ گہری اور پھر زیادہ چوڑی خندق نہیں کھود سکتے تھے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ خندق جو مسلمانوں نے کھودی اس پر سے ایک اچھا گھوڑے سوار اپنے گھوڑے کو کدا کر آ سکتا تھا۔ پھر مشکل یہ تھی کہ ایک میل لمبے علاقہ کی حفاظت مسلمانوں کے سپرد تھی۔ اور مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو تھی۔ سات سو آدمیوں کا چوبیس گھنٹے متواتر اس کی حفاظت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ چنانچہ ایک دو دن کے بعد کفار نے فیصلہ کیا کہ بہترین طریق مقابلہ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو تھکایا جائے۔ انہوں نے اپنی فوج کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ چوتھا حصہ حملہ کرتا تھا اور باقی لوگ آرام کرتے تھے۔ اور جب وہ لوگ تھک جاتے تو دوسری تازہ دم فوج انکی جگہ آ جاتی۔ فرض کرو کہ وہ دس ہزار تھے تو صرف اڑھائی ہزار مقابلہ کرتے اور ساڑھے سات ہزار آرام کرتے۔ جب اڑھائی ہزار مقابلہ کر کے تھک جاتے تو واپس چلے جاتے اور دوسرے اڑھائی ہزار ان کی جگہ آ جاتے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے ایک منٹ بھی آرام کرنا ناممکن تھا کیونکہ ان کی تعداد تھوڑی تھی اور انہوں نے اپنا سات سو آدمی تمام خندق پر پھیلا رکھا تھا۔ چنانچہ بیسیوں واقعات ایسے ہوئے کہ دشمن کے آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر خندق پر سے کودے اور مسلمانوں کے علاقہ میں آ گئے مگر باوجود اس کے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچ سکے۔ سر ولیم میور SIR WILLIAM MUIR اسلام کے شدید دشمنوں میں سے ہے مگر باوجود شدید دشمن ہونے کے وہ بڑا ذہین انسان ہے اور جہاں کوئی بات اسے مسلمانوں کی تائید میں نظر آتی ہے اسے بھی وہ بیان کرنے میں ہچکچاتا نہیں وہ اپنی کتاب میں جنگ احزاب کے واقعات پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور پھر کہتا ہے

کہ اتنے دنوں تک مسلمانوں پر حملہ کیا گیا اور متواتر اور پوری شدت کے ساتھ کیا گیا۔ یہ حملہ چوبیس چوبیس گھنٹے مسلسل کیا گیا اور مسلمانوں کو آرام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پھر اگر خندق زیادہ چوڑی ہوتی تب بھی ہم سمجھ سکتے تھے کہ مسلمان مطمئن تھے کہ دشمن ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ متعدد بار دشمن کے آدمی مسلمانوں کے علاقہ میں آئے اور پھر واپس بھاگنے پر مجبور ہو گئے وہ سوال اٹھاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اتنی تھوڑی تعداد کے باوجود اور دشمن کے اتنے متفقہ حملے کے باوجود جبکہ مسلمانوں کو آرام کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ ایسا کیوں ہوا کہ دشمن جب بھی خندق پار کر کے آتا وہ واپس بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کی صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وجود ان کی نگاہوں میں اتنا عزیز تھا اور اتنا قیمتی اور مقدس تھا کہ جب دشمن قریب پہنچتا تو مسلمان انسان نہیں رہتے تھے بلکہ وہ کچھ اور ہی چیز بن جاتے تھے۔ وہ پہاڑوں کو دھکیل کر پرے پھینک دینے پر تیار ہو جاتے تھے، وہ سمندروں کو چیر کر گذر جانے پر آمادہ ہو جاتے تھے، وہ اس وقت آپ کی محبت میں اپنے وجود کو بھول جاتے تھے۔ اپنی انسانی کمزوریوں کو بھول جاتے تھے اور مجنونوں کی طرح آگے بڑھ کر ہر سامنے کی چیز کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر پھینک دیتے تھے[۱۱]۔ چنانچہ جب کبھی دشمن کا لشکر کود کر آگے آیا اور اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھنا چاہا تو وہ دیوانہ وار اس کے مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے کم سامان اور کم تعداد کے باوجود زیادہ ساز و سامان اور زیادہ تعداد رکھنے والوں کو ایسا مارا کہ ان کے لئے سوائے بھاگنے کے اور کوئی چارہ نہ رہا[۱۲]۔

غرض فتح بے شک آئی مگر کئی ہفتوں کے بعد۔ درمیانی عرصہ جو ایک نہایت ہی کٹھن زمانہ تھا۔ اس غیر معمولی ایثار۔ اور قربانی اور بے مثال اخلاص اور فدائیت کی وجہ سے گذرا جس کا مظاہرہ عرب کے مختلف حصوں کے مسلمانوں نے کیا۔ جن کی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی رشتہ داریاں نہیں تھیں مگر دینی لحاظ سے ان کا آپ کے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ انہوں نے آپ کے لئے اتنی بڑی قربانیاں کیں کہ قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی باپ اپنے بیٹے کے لئے یا کوئی بیٹا بھی اپنے باپ کے لئے ایسی قربانی نہیں کر سکتا۔ تو دینی رشتہ دنیوی رشتوں سے بہت زیادہ اہم ہوتا ہے یہی وہ رشتہ ہے جو اپنی شدت کے لحاظ سے اور اپنی اہمیت اور تقدیس کی وجہ سے چھوٹی قوموں کو آگے بڑھاتا اور انہیں دنیا پر غالب کر دیتا ہے۔ ان کے اندر اس تعلق کی وجہ سے قربانی اور ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اسے دبا نہیں سکتی۔ بدر کی جنگ میں تھوڑے سے مسلمان تھے اور پھر انہیں لڑائی کا کسی قسم کا تجربہ حاصل نہیں تھا۔ جب کفار کا لشکر مسلمانوں

کے قریب پہنچ گیا تو کفار نے یہ جائزہ لینے کے لئے کہ مسلمانوں کی کتنی تعداد ہے اپنے ایک آدمی کو تحقیقات کے لئے بھجوایا۔ اس نے ان اونٹوں سے جو ذبح کئے جارہے تھے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگا لیا اور انہیں جا کر کہا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی تعداد تین سو ساڑھے تین سو کے درمیان ہے۔ اس پر انہوں نے سمجھا کہ اتنی تھوڑی تعداد کا تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں گے۔ مگر جو شخص تحقیقات کے لئے گیا تھا اس نے کہا کہ واقعہ تو یہی ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں بس تین سو اور ساڑھے تین سو کے درمیان ہے لیکن میری نصیحت یہی ہے کہ آپ لوگ ان سے لڑنے کا ارادہ نہ کریں۔ کیونکہ وہ ہیں تو تھوڑے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں جب ان کو دیکھنے کے لئے گیا تو میں نے اونٹوں اور گھوڑوں پر آدمی سوار نہیں دیکھے بلکہ موتیں سوار دیکھی ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر شخص اس نیت اور ارادہ سے اپنے گھر سے نکلا ہے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں اور بائیں مرجائیگا مگر واپس نہیں جائیگا۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ اخلاص اور فدائیت کی روح ان میں کس طرح پیدا ہوئی؟ اسی دینی تعلق کی وجہ سے جو ان کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ پھر یہ تو دور کی بات ہے تیرہ سو سال گزر گئے اور مسلمان نسلاً بعد نسل کمزور ہوتے چلے گئے۔ دین کی محبت ان کے دلوں سے کم ہو گئی، اسلامی احکام پر عمل جاتا رہا، غفلت اور سستی ان پر چھا گئی مگر اس گئے گذرے زمانہ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ان کے دلوں میں ایسی مرکوز نظر آتی ہے کہ اسے دیکھکر مُردہ ایمان بھی زندہ ہو جاتا ہے۔

میں چھوٹا تھا کہ قادیان میں ایک عورت آئی وہ میراثی خاندان میں سے تھی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو بھی لائی، اُسے سل کا مرض تھا۔ اس نے حضرت مولوی صاحب خلیفہ اوّلؓ کی تعریف سُنی تو وہ آپ کے پاس اپنے لڑکے کو علاج کے لئے لے آئی۔ مگر جب وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملی تو اس نے کہا کہ اصل میں میں اس لئے نہیں آئی کہ اپنے بیٹے کا علاج کرواؤں بلکہ دراصل میں اس لئے آئی ہوں کہ میرا بیٹا عیسائی ہو گیا ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ نے عیسائیوں کا بڑا ردّ کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس لڑکے کو سمجھائیں تاکہ یہ کسی طرح مسلمان ہو جائے۔ اس نے بتایا کہ ہمارا قبیلہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت گھٹیا قسم کا ہے ہمارا پیشہ گانا بجانا ہے۔ میں خود بھی شادیوں پر گاتی بجاتی ہوں لیکن میں اس امر کو برداشت نہیں کرسکتی کہ میرا بیٹا عیسائی ہو کر مرے۔ میں آپ کے پاس اسے اس لئے لائی ہوں کہ وہ کسی طرح مسلمان ہو جائے۔ میں اس وقت چھوٹا بچہ تھا مگر وہ نظارہ ایسا تھا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سامنے بیٹھی ہے اس نے ہاتھ

جوڑے ہوئے ہیں اور زار و قطار رو رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ حضور میرا ایک ہی بیٹا ہے
مَیں نہیں چاہتی کہ یہ اچھا ہو جائے مَیں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ یہ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے اور
پھر خواہ اسی وقت مر جائے۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت تیرہ سو سال
گذرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے دلوں میں اتنی پائی جاتی ہے کہ ایک ایسی عورت جو نہایت ادنیٰ
اور ذلیل خاندان میں سے تھی وہ بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا لڑکا کلمہ پڑھے بغیر
اس دنیا سے گذر جائے۔ مگر وہ لڑکا بھی بڑا پکا عیسائی تھا۔ اسے تبلیغ شروع ہوئی تو اس نے
ارادہ کیا کہ قادیان سے بھاگ جائے۔ چنانچہ ایک رات کو وہ اٹھا اور بیماری کی حالت میں
ہی بٹالہ کی طرف بھاگ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ماں کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ چارپائی
خالی پڑی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا لڑکا بھاگ گیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی اور
پانچ سات میل پر جا کر اس نے اپنے بیٹے کو پکڑا اور پھر اسے قادیان واپس لائی۔ اور
اس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہنے لگی کہ حضور دعا کریں یہ ایک
دفعہ کلمہ پڑھ لے پھر بے شک مر جائے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ آخر خدا نے اس کی دعا سن لی
اور وہ لڑکا مسلمان ہو گیا اور پھر چند دنوں کے بعد مر گیا۔ اس کی ماں نے اس صدمہ کو بڑے
صبر سے برداشت کیا۔ اور وہ خوش تھی کہ میرا لڑکا عیسائی ہو کر نہیں مرا بلکہ کلمہ پڑھ کر مرا ہے۔
تو رشتوں کی محبت بے شک جاہل لوگوں اور نادان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے لیکن انسانیت
کا مقام اس محبت سے انسان کو اونچا لے جاتا ہے۔ جتنا نیچے چلے جاؤ محبت کا ذریعہ مادیت
ہوتی ہے لیکن جتنا اوپر چلے جاؤ محبت کا ذریعہ روحانیت ہوتی ہے۔ جتنا جتنا انسان جانوروں
میں شامل ہو گا۔ اتنی ہی اس میں مادیت والی محبت اور بھائیوں اور رشتہ داروں کی محبت
زیادہ ہو گی اور جتنا جتنا اونچا ہو گا۔ اتنی ہی اس کی محبت بھی بلند سے بلند تر ہوتی چلی
جائے گی۔ پہلے وہ اپنی اولاد سے زیادہ محبت رکھے گا۔ پھر اَور اونچا ہو گا تو اپنے خاندان
سے محبت رکھے گا۔ اَور اونچا ہو گا تو اپنے وطن سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ اور اونچا ہو گا
تو اپنی قوم سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ اَور اونچا ہو گا تو انسانیت سے محبت کرنے لگ جائیگا۔
اَور اونچا ہو گا تو دین الٰہی سے محبت کرنے لگ جائیگا۔ اور اونچا ہو گا تو فرشتوں سے تعلق
رکھنے لگ جائے گا۔ اَور اونچا ہو گا۔ تو اس کا خدا سے تعلق ہو جائے گا۔ مگر خدائی تعلق کا پہلا
زینہ خدا تعالےٰ کے نبیوں سے تعلق پیدا کرنا ہے جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ تم چھلانگ
لگا کر چھت پر چڑھ سکو اسی طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف راہنمائی کرنے
والے وجودوں کو چھوڑ کر تم خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کر سکو مگر جس طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے

کہ چھت پر بیٹھا ہوا انسان جب دیکھتا ہے کہ کسی پر شیر یا ڈاکو نے حملہ کر دیا ہے تو وہ بھی گر کر اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اسی طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ جب دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اس سے ملنے کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں ہے کہ اسے انبیاء کی ہمسائی میسّر نہیں آسکتی تو وہ خود اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے مگر ایسا بہت شاذ ہوتا ہے اور شاذ پر کسی قانون کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ عام قانون یہی ہے کہ جو لوگ خدا نما وجود ہوتے ہیں انہی کے ذریعہ انسان کو روحانی ترقی ملتی ہے۔ اور اس ترقی کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ انسان دنیوی محبتوں کو سرد کر کے، ان کی محبت کو اپنے اوپر غالب کرے۔ جب وہ ان کی محبت کو غالب کر لیتا ہے تو ان کا نمونہ اختیار کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی غیر ہے جس کی میں اقتداء کر رہا ہوں بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا باپ ہے اور اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ یہی سبق اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں سکھایا گیا ہے اور پھر آگے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ ابراہیمؑ کی اولاد میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پھر جو کام اسمٰعیلؑ نے کیا وہی کام وہ خود بھی کرنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اگر اسمٰعیلؑ نے یہ قربانی پیش کر دی تھی تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس لئے کہ وہی خون جو اسمٰعیلؑ کی رگوں میں دوڑ رہا تھا میری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔ اور میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹا ہو کر ابراہیمؑ کا بھی بیٹا ہوں اور ابراہیمؑ کا بیٹا ہو کر اسمٰعیلؑ کے کاموں میں اس کا شریک ہوں پس جو کام اس نے کیا وہ میں بھی کروں گا۔ جو شخص اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کو دیکھتا ہے اس کے لئے عید الاضحیہ بالکل اور چیز ہو جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دوسروں کی باتیں سن کر نصیحت حاصل کرنا عقلمند انسان کا کام ہے۔ یہ بھی درست ہے مگر اپنے ہی خاندان کے افراد کی قربانی اور ان کا نمونہ جو تغیر انسان کے اندر پیدا کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے کی قربانی اور اس کا نمونہ تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔

پس عید الاضحیہ کے آنے پر ہر مسلمان یہ سبق تازہ کرتا ہے کہ اس میں کسی غیر کا ذکر نہیں بلکہ میرے بھائی اسمٰعیلؑ کی قربانی کا ذکر ہے۔ اگر اس نے ایسا نمونہ دکھایا تھا تو میں کیوں نہیں دکھا سکتا۔ اگر ابراہیمؑ کا ایک بیٹا ایسی قربانی کر سکتا ہے۔ تو اس کا دوسرا بیٹا ایسی قربانی کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چونکہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل میں سے ہیں جو ساری دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اس لئے ایک سچا مسلمان تو اس موقع پر یہ کہے گا کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی راہ میں اپنا ایک بیٹا قربان کیا تھا تو میں دین کی راہ میں اپنے

دو بیٹے پیش کروں گا۔ کیونکہ میں ابراہیمؑ ہی کی نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی آل ہوں۔
غرض ہر مسلمان اگر حقیقی معیار رُوحانیت کو حاصل کرنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے سمجھنے کی عادت ڈالے۔ پھر آدم تک جو سلسلہ انبیاء جاری رہا اس کا اپنے آپ کو جزو سمجھے۔ جب وہ اس بات کو سمجھ لے گا تو اس کا اخلاص بالکل اور رنگ اختیار کرلے گا۔ اس کی روحانیت ترقی کر جائے گی، اس کی قربانی بڑھ جائے گی۔ اور اس کی روح ایک نیا جامہ پہن لیگی۔ اور جو چیز اسے پہلے دوسروں کے باپ میں نظر آتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان میں نظر آنے لگے گی۔ تب وہ خطرناک وادیاں جن میں سے گذرتے بلکہ داخل ہوتے بھی لوگ ڈرتے اور گھبراتے ہیں ان میں سے گذرنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا اور وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں تیزی سے ترقی کرنے لگے گا۔ پس اس عید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ روح اپنے اندر پیدا کرو کہ یہ دوسروں کے باپ کے قصے نہیں بلکہ تمہارے اپنے باپوں اور اپنے خاندان کے واقعات ہیں جو تمہارے لئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کو عید الاضحیہ کے ذریعہ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔"

(المصلح کراچی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

لہ ۔ سنن ابی داؤد کتاب صلوٰۃ العیدین باب الخطبۃ یوم العید۔
لہ ۔ المائدہ ۵ : ۱۰۵ ۔ الانعام ۶ : ۸۲ ۔ الاعراف ۷ : ۲۸
لہ ۔ صحیح بخاری کتاب المناقب (بنیان الکعبۃ) باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔
لہ ۔ الفاتحہ ۱ : ۶-۷
لہ ۔ البقرہ ۲ : ۱۳۶ ۔ آل عمران ۳ : ۹۶ ۔ النساء ۴ : ۱۲۶
لہ ۔ الاعراف ۷ : ۱۶۰ ، سبا ۳۴ : ۲۹
لہ ۔ تفسیر دُر منثور جلد ۵ صفحہ ۲۳۷
لہ ۔ صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب ۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۲۰۱/۲ تاریخ طبری ۲۲/۲ ، زرقانی شرح المواہب اللدنیہ ۱۸۹/۲
لہ ۔ غزوۂ احزاب یا خندق کے متعلق نوٹ صفحہ ۲۰۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد۲ ص۱۱۱

۱۲ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد۲ ص۱۰۵

۱۳ ۔ زرقانی شرح مواہب اللدنیہ جلد۲ ص۱۰۵

۱۴ ۔ سیرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی جلد اوّل ص۳۰۸

۱۵ ۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۱۸۰/۲ ، زرقانی شرح المواہب للدنیہ ۱۱۱/۲

۱۶ ۔ تاریخ طبری جلد۲ ص۴۷۵

۱۷ ۔ یہ تبصرہ صرف جنگِ اُحد کے ضمن میں کیا گیا ہے ۔ (WILLIAM MUIR; LIFE OF MAHOMET. V.3. P.172-173.)

۱۸ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد۲ ص۱۱۷

۱۹ ۔ عمیر بن وہب الجمحی

۲۰ ۔ تاریخ طبری جلد۲ ص۴۴۶

۲۱ ۔ اس سارے واقعہ کے راوی حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ ہی ہیں معلوم ہوتا ہے سائلہ مذکورہ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں جب یہ درخواست پیش کی تو اس وقت حضور رضی اللہ عنہ موجود تھے اس لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے ۔